# ہندوستانی مسلمانوں کے محسن اعظم سرسید احمد خان

ڈاکٹر سعادت سعید، وزیٹنگ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

**Abstract**

Sir Sayed Ahmad Khan was a great leader for south Asian Muslim Nation. He fully guided them after the horrible end of their glorious past in India. He analyzed the causes of their defeat thoroughly and gave them a new vision for their survival in the future. He suggested to the Muslims of India that they should learn English language and through it new scientific knowledge which could take them to the path of modern enlightenment in this article his rational approach, is discussed.

ایک اجنبی ثقافت کے ہاتھوں مفتوحہ عوام کی ثقافتوں کی بربادی کا غم ہو، جنگ آزادی کی نذر ہونے والی بے گناہ آبادیوں کا دکھ ہو، محفلوں کے لٹنے کا نوحہ ہو، غم رزق ہو یا غم عزت یہ سب کچھ ایک حساس انسان کی طرح سر سید احمد خان کے ضمیر کا کانٹا بنا۔ انہوں نے اپنے دور کے ہندوستان میں بسنے والی اپنی قوم کو انفعالیت، بے عملی، یاسیت، کسمپرسی، بے بسی کی دلدلوں سے باہر نکالنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ ان کے سامنے سب سے پہلا کام یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کی از سر نو شیرازہ بندی اور یک جہتی کے لیے کوشاں ہوں۔ انگریزی اقتدار کی وجہ سے وہ جس سیاسی بحران کا شکار تھی اسے اس سے باہر لا کر نئے سیاق و سباق میں سیاسی آزادی کی تحصیل کے امکانات کی جانب عملی طور پر پیش قدمی کی دعوت دی جائے۔

سر سید احمد خان کو احساس تھا کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے لیے فی الفور کوئی منصوبہ کارآمد ثابت نہیں ہوگا۔ ہندوستان پر مسلمانوں کی طویل مقامی حکومت کے خاتمے کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں جس نوع کا خلا پیدا ہوا تھا اور مستقبل میں ان کی ثقافت پر اس کے جو اثرات مرتب ہونے والے تھے سر سید احمد خان نے ان کے بارے میں غور و خوض کیا اور اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے اس غیر متوقع آفت سے اپنے بھائی بندوں کو نجات دلانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ چنانچہ ان کی ضمیری نفسیات نے انہیں اپنی قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی جو ترغیب دی اس سلسلے میں اٹھائے جانے والے اقدام کی بدولت انہیں مثبت کامیابیاں ملنے کی توقع تھی۔

ماضی میں ہندوستان ایک کثیر القومی ملک تھا، حال میں بھی اس کی یہی حالت ہے اور مستقبل میں بھی اس صورتِ حال کے تبدیل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ سر سید احمد خان کو جہاں انگریزی غاصبانہ اقتدار کی نزاکتوں کو سمجھ کر میدان عمل میں اترنا تھا وہاں انہیں اس امر کا احساس بھی تھا کہ ماضی میں مسلمان فاتحین نے ہندوستان پر جو اقتدار قائم

کیا تھا اس کے خلاف مقامی قومیتوں کا شدید ردعمل سامنے آسکتا ہے اور وہ قومیتیں مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ایسے میں ان کے سامنے داخلی طاقتوں کی دست برد سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا خطرناک معاملہ بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کو کام میں لاکر مسلمانوں کو از سر نو اقتدار کی مین سٹریم میں لانے کے لیے عملی اقدامات کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اس احساس کی بدولت وہ مستقبل میں قومی حفاظت کے لیے سرگرم عمل بھی رہے۔

سر سید احمد خان جانتے تھے کہ نئے نافذ شدہ انگریزی سیاسی، انتظامی اور ثقافتی نظام میں اگر مسلمانوں کو معاشی ترقی کی منزلوں کی جانب سفر کرنا ہے تو انہیں اپنی ان تمام قدیم پیشوں کو ترک کر کے کہ جو مسلم شاہی اقتدار کو سنبھالا دیئے ہوئے تھے، نئی طرز کے پیشوں کو اپنانا ہے تا کہ نئے زمانی تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ اس سیاق و سباق میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں رائج ہونے والے نئے پیشوں سے وابستگی کو از بس ضروری قرار دیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ انگریزوں کے قائم کردہ نئی طرز کے مدرسوں سے جوق در جوق نئے نصابوں کے تحت تعلیم حاصل کر کے انگریزی اقتدار میں اپنے لیے مناسب جگہیں بنائیں۔

مرزا غالب نے یہ شعر جس بھی پس منظر میں لکھا ہو کہ:

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اسے قومی شکست کے حوالے سے دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ سر سید کو احساس تھا کہ مسلمان اب نہ تو اقتدار میں رہے ہیں اور نہ ہی ان کی ہندوستان کے نئے سیٹ اپ میں کوئی زیادہ اہمیت ہے۔ ان کی طاقت کا شیرازہ بری طرح بکھر چکا ہے۔ ان کی شان و شوکت ملیا میٹ ہو چکی ہے۔ دشمنوں نے انہیں گھیر رکھا ہے۔ وہ اس وقت تک اس صورت حال کے قیدی رہیں گے جب تک وہ اپنی قومی طاقت کی بازیافت نہیں کر لیتے۔ کسی قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے جس نوع کی صنعتی ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحصیل کی ضرورت ہوتی ہے سر سید احمد خان اس امر سے پورے طور پر واقف تھے چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان نئے تعلیمی تقاضوں کی روشنی میں نئے سرے سے نئی طرز کی خواندگی کی جانب آئیں گے تو ان میں سائنسی تحقیق کا مادہ پیدا ہوگا جو آئندہ چل کر انہیں ہر نوع کے جدید پیداواری نظام کے تقاضوں کے مطابق عمل پیرا کر سکے گا۔ نئے انگریزی نظام میں مسلمانوں کو سب کچھ صفر سے شروع کر کے خود کفالت کی منزلوں تک رسائی کے مرحلے درپیش تھے۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں سے توقع باندھی کہ وہ ان مرحلوں سے آشنا ہو کر قومیتی مقابلے کی دوڑ میں سبقت لینے کے اہل ثابت ہوں گے۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو جس ڈگر پر ڈالا اس پر مشرقی ذہنیت رکھنے والے جتنے بھی چیں بہ جبیں کیوں نہ ہوئے ہوں اور کٹھ ملائیت کے مرض میں مبتلا لوگوں نے ان کی جتنی بھی مخالفت کی ہو سر سید احمد خان کی دانست میں قومی وقار اور ملی نظریات کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں استقلال کے ساتھ آگے بڑھنا ہی ہوگا۔ ان کے لائحہ عمل میں اس وقار اور نظری تحفظ کے معاملے بر سر فہرست موجود تھے۔ اس فہرست کے دیگر مندرجات میں قومی انفرادیت، حق خود ارادیت، عظمت و شوکت کی بازیافت، آزادی کا احساس، اپنی زمین سے

محبت،قومی خودی کی بحالی وغیرہ شامل تھے۔علاوہ ازیں انہیں یہ سب کچھ انگریزی استعمار اور اس کی عملی حکمتوں کے عین درمیان میں رہ کر کرنا تھا۔ان حکمتوں میں سے ایک حکمت ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' بھی تھی۔اس حکمت عملی کے تحت مسلمانوں اور ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے مابین یہ یہ تفرقے پیدا کئے گئے اور ان کے درمیان باہمی مناقشات اور نزاعات کے غیر مختتم سلسلے شروع کروا دیئے گئے۔یعنی پاکستان کا قیام انگریزوں کی اسی ''بٹوارانہ حکمت عملی'' کا منطقی نتیجہ ثابت ہوا۔آلڈس ہکسلے کا کہنا ہے:

''الفاظ وہ رابطہ ہیں جن کے ذریعے ہم اپنے تجربات کو مربوط رکھتے ہیں۔ان کے بغیر ہم اپنے آپ تک محدود ہو جاتے ہیں۔''نفرت'' از خود اتنا مضبوط جذبہ نہیں ہے کہ اس کو حیوان بھلا نہ سکیں۔حتیٰ کہ دشمن کی موجودگی میں بھی بھلایا جا سکتا ہے۔آپ کبھی بلیوں کے جوڑے کو جب وہ لڑنے کے قریب ہو،غور سے دیکھیں۔ان کی آنکھیں خوفناک انداز میں چمکتی ہیں اور کے گلے سے خرخراہٹ کی عجیب سی آواز اٹھتی ہے اور عجیب سا شور،جب کہ ان کی دم پیچ و تاب کھاتی ہے اور غصے سے کانپتی ہے۔اس دشمنی کی شدت کا کیا مقصد ہے۔قریب ہے کہ وہ پھٹ پڑے کہ اچانک دونوں بلیاں مڑ جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو سلام کرتی ہیں۔اور وہی غصہ اور شدید نفرت اچانک ایک صلح بھری آواز میں بدل جاتی ہے۔جانوروں کی محبت ان کی نفرت کی طرح مایوسی کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔گونگی، بہری مخلوق کی زندگی ان کے آپس میں رضامندی کے بے جوڑ سے واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔اسی طریقے سے انسانی کردار میں تبدیلی اور جامعیت کا انحصار ان الفاظ پر ہوتا ہے جن کے ساتھ تمام انسانی تجربے کو مربوط کیا جاتا ہے۔ہماری بات بامقصد ہے اور اس لئے بامقصد ہے کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کریں جو ہماری خواہشات کو منطقی طور پر عقل اور جواز دے سکیں۔جب ہم کسی دشمن کے سامنے ہوتے ہیں تو ہم اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے جذبات ایک سر کھجانے کی حد تک بھی اپنے اصل سے ہٹ جائیں۔کیونکہ لفظ ''دشمن'' ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں اور وہ ہمیں اس سے ناراض ہونے پر قائل کرتا ہے۔اسی طریقے سے لفظ ''محبت'' بہت سی بے پرواہیوں اور اکتاہٹوں کے ان شگافوں کو پر کرنے کا نام ہے جو وقتاً فوقتاً بہت ہی قریبی پیار کرنے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔احساس اور خواہش دونوں ہم میں قوت محرکہ پیدا کرتے ہیں۔الفاظ ہمارے کام میں تسلسل اور سمت متعین کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔غیر مناسب اور الفاظ کا برا انتخاب ہمارے خیالات کو پست کرتا ہے اور ہم سے غلطیاں اور حماقتوں کا باعث بنتا ہے اور بہت سی لاعلمیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔بہت سی حماقتوں کو جن کو گوتم بدھ گناہ قرار دیتے ہیں وقت سے پہلے روکا جا سکتا ہے۔کیونکہ شعوری طور پر اور غیر شعوری طور پر ہم کبھی بھی سمجھنے میں ناکام نہیں رہتے اور بعض اوقات ناسمجھی

ہمیں بہت سی ناخوشگوار ذمہ داریوں سے بچا دیتی ہے۔ کیونکہ لاعلمی ایک بہترین بہانہ ہے کہ انسان پسند کے کام کرے اور ناپسند کاموں سے انکار کر دے۔ ہماری خود پرستی ہمیں نہ صرف ہمارے خارجی دشمنوں سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ ان تمام ذاتی حملوں سے بھی جن سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی منسوب ہوتی ہے۔ جہالت خود پرستی کا ایک بہت ہی موثر دفاعی نظام ہے جو ہمیں حماقتوں سے بچاتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے تجربات کو تسلسل دینے کے لئے ان الفاظ کا سہارا لیتے ہیں جو حقائق کو غلط ثابت کرتے ہیں اور حقائق کا غلط ثابت کرنا ہی ہماری خود پرستی کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔''[۱]

انگریزوں نے ہندوستانیوں کے مقابلے میں انتہائی قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے بھی جس دھڑلے سے حکومت کی اور اپنے اقتدار کو مستحکم کیا اس کے پیچھے باہمی محبتوں اور نفرتوں کے کئی سلاسل کو ابھار کر ہندوستانی عوام کو دست و گریبان کر دیا اور اس کے نتیجے میں خود چین سے حکومت کی۔ انگریزی اقتدار کے ابتدائی دور سے لے کر سن سینتالیس تک ہندوستانی عوام باہمی دشمنیوں اور نفرتوں کے چکروں میں گرداں رہے اور انگریزی پرنس حکومت کرتے رہے۔ میکاویلین پالیسیوں کے چراغ جلتے رہے اور مقامی باشندے نفرتوں اور دشمنیوں کی آگ میں جھلستے رہے۔ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں نے جس ''ڈیم ایکسکیوز'' کا سہارا لیا اور قابض ہونے کے بعد جس طرح مقامی باشندوں کو اجنبی ہونے پر مجبور کیا وہ ان کی میکاویلین حکمت عملی سے جنم لینے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شاخسانہ ہے۔

اس پر علامہ اقبال نے کھل کر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستانی عوام افتراقات کا شکار ہیں انہیں مجتمع ہو کر انگریز سامراج کا مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن افسوس کہ میکاویلین حکمتوں کے نتیجے میں مقامی ہندوستانی باشندے انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، یہاں تک کہ وہ یہ بات یاد کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بہادر شاہ ظفر اور رانی جھانسی کی قیادت میں متحدہ لڑائی لڑی تھی۔ اس لڑائی کو سکھوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کرنا کام کیا اور یوں ہندوستان میں تینوں بڑے سٹیک ہولڈرز باہمی نفرتوں اور دشمنیوں کے ایسے سلاسل کے اسیر ہو گئے کہ انہیں ایک دوسرے کو اپنی اپنی مذہبی اور سیاسی منطق کے تحت قتل کرنا مقدس لگنے لگا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تینوں قومیں اپنے اپنے شہیدوں کے دن مناتے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف اپنی نفرتوں اور دشمنیوں کے بھانبڑ جلاتی رہتی ہیں۔ یعنی ایک دھرتی کے باشندے مذہبی اور سیاسی نفرتوں کے اسیر ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور دشمن سات سمندر پار بیٹھا ان کو متواتر اپنی صنعتوں کا مال اور اپنے اسلحے فروخت کر رہا ہے۔ اس صورت حال کو ان کی نئی یا پرانی لسانی نرگشیں تقویت دے رہی ہیں۔ اور یوں جس نوع کی نفرتوں اور دشمنیوں کو مرکز خطابت بنایا جاتا ہے اس کے نتیجے میں مقامی مناقشات میں روز بروز افزونی آتی چلی جاتی ہے اور انسانی اخلاقیات فراموشی کے گڑھوں میں گرتی چلی جا رہی

ہے۔بقول آلڈ ہکسلے:

''ہمارے احمق لوگ غلط زبان استعمال کر کے ایسا تجزیہ پیش کرتے ہیں جو کہ انتہائی عیاری پر مشتمل ہوتا ہے۔ جنگ کے متعلق سب سے بڑے صدمے والی چیز یہ ہوتی ہے کہ اس کا شکار ہونے والے یا آلہ کار انسان ہوتے ہیں۔اور یہ انسان سیاست کی مکروہ روایات کی خاطر قتل ہوتے ہیں یا معصوم لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔اور یہ ہر قسم کے ظلم کی انتہا ہے۔اب سیاست کو بیان کرنے کے لئے زبان کی حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے۔اور سچ کو اس طرح چھپایا جاتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنگ درحقیقت بغیر قصور کے غیر اخلاقی سفا کانہ قتل کا نام نہیں بلکہ مدمقابل کو ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ جس کو ختم کرنا اخلاقی ذمہ داری بن جاتی ہے۔''[۲]

اس پس منظر میں علامہ اقبال کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کا یہ اقتباس کہانی کے مذکورہ رخ سے پردہ اُٹھاتا ہے:

ہندوستانیوں کے نفاق پر چند آنسو
اے ہمالہ اے اٹک اے رود گنگا
یوں رنگ اور چمک کے بغیر کب تک زندگی بسر ہو؟
بوڑھے مرد فراست سے خالی ہیں اور نوجوان محبت سے عاری
مشرق اور مغرب تو آزاد ہیں ہم ہی غیروں کا شکار ہیں
ہماری اینٹ غیروں کی تعمیر کا سرمایہ ہے
دوسروں کے مقصد کے لئے جینا گہری نیند نہیں مرگ جاودانی ہے
یہ وہ موت نہیں کہ جو آسمان سے آتی ہے
اس کا بیج جان کی گہرائیوں سے سر اٹھاتا ہے
اس کے شکار کو نہ تو غسال چاہیے نہ ہی قبر
دور اور نزدیک سے دوستوں کا ہجوم بھی نہیں ہے
اس کے غم میں کسی کا لباس چاک نہیں ہے
اس کی دوزخ آسمان سے پرے نہیں ہے
اسے روز حشر کے ہجوم میں مت تلاش کر
اس کے آج ہی میں اس کا کل ہے
جس کسی نے یہاں بیج بویا یہیں کاٹا
اس بندے کو خدا کے سامنے لے جانا بے سود ہے

وہ قوم جس نے آرزو کا ڈنگ نہیں کھایا
فطرت نے اس کے نقش کو دنیا سے مٹا دیا
تخت و تاج کا اعتبار جادوگری سے ہے
یہ کانچ جادوگری سے پتھر کی مانند سخت ہے
اس روشن جادو کے حکم کو اختیار نہ کر
کافری کفر سے اور دین داری دین سے ہے
ہندوستانی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں
انہوں نے پرانے فتنوں کو پھر سے جگا دیا ہے
یوں فرنگی مغربی زمین کے باشندے
کفر اور دین کے جھگڑے میں ثالث بن گئے
کوئی نہیں جانتا یہ چمک پانی کی نہیں سراب کی ہے
انقلاب، اے انقلاب اے انقلاب
اے کہ تجھے ہر پل آب و گل کی فکر ہے
خدا سے ایک زندہ دل طلب کر
اگرچہ اس کا آشیاں دنیا میں ہے
نو آسمان اس ایک دل کے سرگشتہ ہیں
ہرگز خیال نہ کر وہ مٹی سے ہے، آسمانوں کی بلندی سے ہے
اس کے لئے یہ جہاں اپنے دوست کی گلی کا حریم ہے
وہ لالے کی پوشاک سے اپنے محبوب کی خوشبو حاصل کرتا ہے
وہ ہردم زمانے سے جنگ کررہا ہے
اس کی ضرب سے راستے کا پتھر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے
وہ منبر اور دار سے واقف ہے
اس کی اپنی آگ اس کی محافظ ہے
وہ خود ایک ندی ہے لیکن اس کے اندر کئی سمندر موجود ہیں
اس کی موج طوفان کی خبر دیتی ہے
وہ تنور کی روٹی کے بغیر بھی زندہ اور پائندہ ہے
وہ اس گھڑی مرتا ہے کہ جب بے حضور ہو جاتا ہے

بدن کے شبستان میں چراغ کی مانند
اس سے خلوت اور انجمن دونوں روشن ہیں
ایسا خودنگر اور اللہ مست دل
کسی درویش کے بغیر دستیاب نہیں ہوتا
اے جوان اس کا دامن مضبوطی سے پکڑ
تو غلامی میں پیدا ہوا ہے آزاد انسانوں کی موت مر[۳۲]

کفر و دین کے یہ جھگڑے سر سید کے دور میں نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ ہندو مسلمان سے نبرد آزما ہوا۔ ایک طرف سے مسلم تاریخ و ثقافت پر سکھ حملہ آور ہوئے اور دوسری طرف مسلمانوں نے دیوبندی اور بریلوی کے جھگڑے شروع کیے۔ اس سے مسلم قوم کی رہی سہی آبرو بھی جاتی رہی۔ سر سید احمد خان نے، اپنے تصورات کی روشنی میں، مسلم دنیا میں موجود علمی ذخائر کے ساتھ ساتھ نشاۃ الثانیہ کے بعد ابھرنے والے نئے علوم کو اہمیت دے کر مسلمانوں کو مستقبل میں سرخرو ہونے کے رستے پر گامزن کیا۔ ان کی تحریک روشن خیالی کی تحریک تھی۔

سر سید احمد خان کے علمی و ثقافتی کارناموں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔ سر سید نے جدید فکر و شعور کی مدد سے روشن خیالی کا عندیہ دیا۔
۲۔ وہ جدید علوم اور انگریزی زبان کے اکتساب کو امکانی ترقی کے لیے لازمی قرار دیتے تھے۔
۳۔ مذہبی روایت پرستی سے باہر نکل کر انہوں نے بعض مذہبی معاملات کی سائنسی اور عقلی توجیہات پیش کیں۔
۴۔ وہ مسلم ماضی کے ثقافتی اور تہذیبی اثاثوں کے قدردان تھے
۵۔ روشن خیال تصورات کی تلاش میں وہ تاریخ کی جانب لوٹے اور انہوں نے اپنی نئی تعبیرات سے نئے سائنسی ذہن سے مکالمہ کیا۔
۶۔ سر سید احمد خان مذہبی اور روحانی زندگی کو مادی زندگی کی ترقیوں کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے
۷۔ ان کے خیال میں دانش اور عقل سے کام لینے میں انسانیت کی فلاح ہے۔
۸۔ وہ سائنس کے قانون علت و معلول کے تحت عقل و حواس کو بروئے کار لانے کی بات کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کئی ایسی تعبیریں کیں جن سے مسلم ذہن نے اتفاق نہیں کیا۔
۸۔ مذہبی حوالوں سے عقل و دانش کا دفاع ان کی روحانی اور ماورائی اپروچ پر دال ہے۔
۹۔ سر سید احمد خان کی دور بین نظروں نے مستقبل کے بہت سے سیاسی و ثقافتی مناظر کو بھانپ لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علحدہ مملکت یا ثقافتی جائے عمل کا تصور دیا تھا۔
۱۰۔ سر سید احمد خان نے ایک رہنما دانشور کی مانند عام انسانوں اور روایت پرست علما کے خیالات سے اختلاف کیا۔ یوں ہندوستان میں خیالات اور فکر کی نئی صورتوں نے سر ابھارا۔

۱۱۔ ان کی فکر نے مذہبی فکر میں انقلابی تبدیلیوں کے امکانات روشن کیے۔

۱۲۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا مقصد واضح تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو سائنس کی برکات راس آئیں اور وہ بھی سائنسی میدانوں میں آگے بڑھ کر اپنا لوہا منوائیں۔

۱۳۔ سائنس کے ساتھ ساتھ روحانی معاملات پر ان کا یقین اس بات کی جانب اشارہ کناں ہے کہ انسان جب تک مادی کائنات کے ذرے ذرے کی تفہیم سے عہدہ برآ نہیں ہوتا اس کی روحانی اور مابعد الطبیعیاتی اپروچ موجود رہے گی۔

۱۴۔ ہر بڑا جینیئس انسانیت کی فلاح کے لیے اپنے فکر کے راہوار دوڑاتا رہتا ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسان کو آزادی، عزت نفس اور برابری کی اقدار کی ضرورت ہے۔سر سید احمد خان نے اپنا یہ دانشورانہ منصب خوش اسلوبی سے پورا کیا ہے۔

## حوالہ جات:

۱۔ آلڈس ہکسلے، الفاظ اور ہمارا رویہ، (ترجمہ) طاہرہ الطاف ملک، تخلیق مکرر، (لاہور: سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، جی سی)، شمارہ۲

۲۔ ایضاً

۳۔ علامہ محمد اقبال، پس چه باید کرد، اے اقوام شرق ، ترجمہ راقم الحروف، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء)، ص:۳۹

## مآخذ:

۱۔ آلڈس ہکسلے، الفاظ اور ہمارا رویہ، (ترجمہ) طاہرہ الطاف ملک، تخلیق مکرر، (لاہور: سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، جی سی)

۲۔ علامہ محمد اقبال، پس چه باید کرد، اے اقوام شرق ، ترجمہ راقم الحروف، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء)، ص:۳۹

☆☆☆